قرآن کا تصور عــدل

شرف الدین اصلاحی

یہ مقالہ انڈو عرب کلچرل ایسوسی ایشن کلکتہ کی فرمائش پر اس بین الاقوامی سیمینار کے لئے لکھا گیا تھا جو جنوری ۱۹۸۳ء میں کلکتہ میں ہوا ۔ سیمینار کا مرکزی موضوع تھا ۔ قرآن کی اخلاقی اور سماجی تعلیمات جو بنی نوع انسان کے لیے یکساں قابل قبول ہیں ۔ ۔ شرکت سے معذوری کے باعث مقالہ سیمینار میں پیش نہ کیا جا سکا ۔ اور اس سے پہلے کہیں طبع نہیں ہوا ۔ (ادارہ)

جیسا کہ سب جانتے ہیں عدل کا تعلق انسان کے سماجی معاملات و مســائل سے ہے ۔ اور دنیا کا کوئی بھی معاشرہ اس کی اہمیت سے انکار نہیں کر ســکتا، خــواہ اس باب میں اس کا اپنا تصور کچھ بھی هــو ۔ اور وہ عملاً اس کے قیام کے لئے سرگرم عمــل ہو یا نہ ہو ۔ قبل اس کے کہ میں اس عنــوان سے براہ راست تعــرض کر کے کچھ کہوں ضروری معــلوم ہوتا ہے کہ چند باتیں بطور مقدمہ اور تمہید کے پیش کر دی جائیں ۔ چونکہ گفتگو قرآن اور اسلام کے حوالہ سے ہے اس لئے ان کے متعــلق بعض بنــیادی اور اصولی باتوں کا ذکر ضروری ہے ورنہ ہو سکتا ہے غلط فہمی یا الجھن پیدا ہو ۔

قرآن ایک آسمانی کتاب یعــنی اللہ کا کلام ہے اور اســلام اس اللہ کا دین ہے جو قرآن کی صورت میں جبرئیل امیں کے ذریعے سلسلہ انبیاء کے خاتم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا تاکہ وہ نوع بشــر کی هــدایت کے لئے اس کی اشاعت کریں ۔ اللہ، محمد صلی اللہ علیہ وسلم، قرآن اور اســلام ہماری گفتگو کے بنیادی نکات ہیں ۔ اور یہ چاروں باہم ایک دوسرے سے مــربوط هــیں۔

ان کی اپنی اپنی حیثیت اور مقــام ہے ۔ اپنی اپنی صفات اور خصوصیات ہیں جن کا خود اللہ رب العزت نے اپنی کتاب میں ذکر کر کے تعین کر دیا ہے ۔ یہ ایسے

مباحث هیں جو بہت تفصیل سے قرآن اور قرآن کے ترجمان رسول اللہ کے اقوال و اعمال میں آگئے ہیں اور جن کے تفصیلی ذکر کا یہ محل نہیں ہے ۔ تاہم بعض باتوں کا ذکر اختصار کے ساتھ ضروری ہے ۔

قرآن کی رو سے اللہ تعالی ہم انسانوں کا ہی نہیں پوری کائنات کا خالق و مالک اور حاکم ہے ، الا له الخلق والامر (اعراف : ٥٤) ۔ تخلیق اس کی ہے اور حکم بھی اسی کا ہے ۔ اور یہ تخلیق بےمقصد نہیں ۔ وہ واحد ہے اور اس کا کوئی شریک و سہیم نہیں ۔ محمد ﷺ اس سلسلہ انبیاء کی آخری کڑی ہیں جو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر نوح ابراہیم ، اسمعیل ، اسحاق ، یعقوب ، موسی ، عیسی علیہم السلام کے بعد حضرت محمد ﷺ پر ختم ہو گیا ۔ وہ اللہ کے بندے بھی ہیں اور نبی بھی ، بالکل اسی طرح جیسے ان سے پہلے* دوسرے انبیاء گذرے ہیں ، جن کی تعداد خدا ہی کو معلوم ہے ۔ کچھ کے نام قرآن نے بتادئیے ہیں جبکہ بہتوں کے نام ہمیں معلوم نہیں ۔ اسلام خدا کا آخری دین ہے جو حضرت محمد ﷺ کے ذریعے بلا امتیاز رنگ و نسل و بلا اختلاف زمان و مکان پوری دنیا بلکہ تمام کائنات کی ہدایت و رہنمائی کے لئے آیا ۔ اور یہی دین حضرت آدم نوح، ابراہیم موسی اور عیسی علیہم السلام کا بھی تھا ۔ یہ بات بھی قرآن میں وضاحت کے ساتھ بیان کر دی گئی ہے ۔ ان الدین عنداللہ الاسلام (آل عمران ۔ ۱۹) ۔ بےشک دین اللہ کے یہاں اسلام ہی ہے ۔ ایک جگہ آنحضور ﷺ کی امت کو مخاطب کر کے فرمایا ۔ الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا ۔ (مائدہ ۔ ۳) آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین پورا کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لئے بطور دین کے اسلام کو پسند کیا ۔ یہ آیت آنحضرت کی زندگی کے آخری ایام میں نازل ہوئی ۔ ایک جگہ قرآن نے یہ بھی صراحت کر دی کہ اسلام کے سوا جو کوئی اور دین اختیار کرے گا تو وہ قبول نہیں کیا جائے گا ۔ ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منه (آل عمران ۔ ۸۵) رد و قبول کا اختیار علی الاطلاق جس ذات کو حاصل ہے وہ تو یہ کہتی ہے کہ جو شخص اسلام کے سوا کوئی اور دین اختیار کرے گا وہ قبول نہیں کیا جائے گا ۔ تو پھر قرآنی تعلیمات کے انسانوں کے لئے قابل قبول ہونے یا نہ ہونے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے ۔ ایک حاکم اور فرماں روائے مطلق کے احکام و فرامین اس لئے

نہیں ہوتے کہ رعیت اسے قبول کرے یا نہ کرے ۔

اسلام کے بارے میں یہ ایک عـــام غلط فہمی ہے جس میں غیراقوام اور حاملین مـــذاہب هـــی نہیں خود مسلمان بھی گرفتار ہیں کہ یہ دین پہــلے پہــل حضرت محمد ﷺ کــو دیا گیا ۔ اور وہ اسکی تاریخ ۱۵ سو سال پہلے آنحضور ﷺ کی بعثت سے شـــروع کرتے ہیں ۔ جبکہ حقیقت یہ ہے اور یہی قـــرآن کی تصریح ہے کہ اس دین کی تاریخ حضرت آدم سے شروع ہوتی ہے جو اس زمین کے پہلے باشنـــدے بھـی ہیں اور پہلے پیغمبر بھی ۔ اسی طرح قرآن بھی خـــود کو جگـہ جگـہ ســـابق انبیـــاء اور کتب سماوی کا مُصَدِّق کہتا ہے۔

گویا معمولی جزئیات کو چھوڑ کر تمـــام انبیـــاء اور صحف سمـــاوی کی بنیادی تعلیمـــات ایک تھیں اور ان کا اصطلاحی نام بھی اســـلام ہی تھا ۔ اسی لئے قـــرآن اور اسلام کی تعلیم کے مطابق ان انبیاء میں تفریق جائز نہیں اور ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان سب پر ایمان لائے ، سب کو مانے اور سب کی عزت کرے ۔ خود مسلم کا لفظ جـــو اسلام کا اسم فاعل ہے کسی نہ کسی شکل میں حضرت ابراهیم کے وقت سے موجـــود ہے ۔ قرآن کی شہادت ہے کہ یہ نام حضرت ابراهیم کا دیا ہوا ہے ۔ ملة ابیکم ابراهیم ھو سما کم المسلمین من قبل (حج ۷۸) تمہارے باپ ابراهیم کی مـــلت ۔ وہی ہیں جنھوں نے تم کو مسلم کا نام دیا ۔

„ قرآن کا تصور عدل „ جو قرآنی تعلیمات کا ایک ذرہ بےمقدار ہے ، راست اسکے متعلق کچھـ عرض کرنے سے پہلے ایک اور نکتـه جس کی وضاحـت ضروری ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کی تعلیمات یا اسلام ایک کل ہے ایک اکائی ہے اور مابعد الطبعیات ہی نہیں طبعیات کا بھی یہ ایک مسلمه اصول ہے کہ جز کو کل سے علیحدہ کر کے متوقع یا مطلوبه نتائج حاصل نہیں کئے جا سکتے ۔ کسی طبی نسخے میں سے ایک یا چند اجزا کو خارج کر کے اسے استعمال کیا جائے گا تو وہ نسخه کارگر نہیں ہو گا ۔ قرآن یا اسلام ، جس کا مقصد دنیا میں ایک صالح پاک امن وآشتی سے بہرہ ور معاشرے کا قیام ہے اس مقصد کے لئے وہ جو نسخه تجویز کرتا ہے وہ مرکب ہے متعدد اجزاء سے ، اس میں عقائد بھی ہیں عبادات بھی ہیں ، اخلاقی اصول بھی ہیں ، سماجی اقدار بھی ہیں ، حقوق بھی ہیں فرائض بھی ہیں اوامر بھی ہیں نواہی بھی ہیں ۔ اور ان میں سے ہر چیز ایک اندازے کے مطابق متوازن مقدار میں رکھی گئی ہے جس میں اپنی طرف

سےکمی بیشی کر کرہ فائدہ حاصل نہیں کیا جا سکتاجو اس کے ساتھ وابستہ ہے ۔ اسلامی عقائد کو عبادات سے یا عبادات اور عقائد کو معاملات سے الگ کر کے اسکے کسی جز کو لے لیا جائے گا تو اسکی مثال ایسی ہی ہو گی جیسے کسی مرض کے ایک مرکب نسخہ میں سے کوئی ایک جز لیکر استعمال کیا جائے ۔ اس صورت میں نتیجہ ظاہر ہے ، دوا سے فائدہ نہیں ہو گا ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن جہاں زندگی کے مختلف پہلوؤں کے لئے قاعدے ضابطے اصول و قوانین وضع کرتا ہے ، یہ تاکید بھی کرتا ہے کہ ان سب پر بیک وقت کمی بیشی کیے بغیر عمل کیا جائے ۔ یہی مطلب ہے ادخلوا فی السلم کافه (البقرہ ـ ۲۰۸) کا ، یعنی اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ ۔ یہ نہیں کہ جو احکام دیئے گئے ہیں یا جو تعلیمات سکھائی گئی ہیں ان میں سے کچھ کو تو لے لیا جائے اور کچھ کو چھوڑ دیا جائے ۔ گذشتہ اقوام میں سے بنی اسرائیل نے احکام الٰہی اور اپنے نبی کی تعلیمات کے باب میں یہ طرز عمل اختیار کیا تو انہیں دنیا اور آخرت دونوں میں انجام بد کی وعید سنائی گئی ۔سورہ بقرہ کی ۸۵ ویں آیت کے یہ الفاظ ملاحظہ ہوں جوبنی اسرائیل کو مخاطب کر کے کہے گئے ہیں ۔ افتؤمنون ببعض الکتاب و تکفرون ببعض فما جزاء من یفعل ذالک منکم الاخزی فی‌الحیاۃ الدنیا و یوم القیامة یردون الی اشد العذاب ۔کیا تم کتاب کے بعض حصے کو مانو گے اور بعض کا انکار کرو گے تو جو لوگ تم میں سے ایسا کریں گے تو ان کی سزا اس دنیا کی زندگی میں ذلت و رسوائی ہو گی اور قیامت کے دن وہ سخت ترین عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے ۔ بنی اسرائیل نے اپنی کتاب اور اپنے رسول کی تعلیمات کے ساتھ یہ رویہ اختیار کیا تو ان کو سختی کے ساتھ تنبیہ کی گئی ۔ قرآن تو یہاں تک مطالبہ کرتا ہے کہ اللہ اور اس کی طرف سے بھیجے گئے تمام رسولوں پر ایمان لاؤ اور کسی کا بھی انکار نہ کرو ۔ بعض کو مان کر اور بعض کا انکار کر کے کوئی شخص ماننے والا نہیں کہلا سکتا ۔ سورہ نساء کی آیت ۱۵۰ میں کس قطعیت اور وضاحت کے ساتھ یہ بات بتا دی گئی ہے ۔ ملاحظہ ہو ،

ان الذین یکفرون باللہ ورسله و یریدون ان یفرقوا بین اللہ ورسله و یقولون نومن ببعض ونکفر ببعض ویریدون ان یتخذوا بین ذالک سبیلا اولئک هم الکافرون حقا واعتدنا للکافرین عذابا مهینا ۔

جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ

اور اس کے رســولوں کے درمیــان فرق کریں اور یہ کہتے ہیں کہ ہم بعض کو تو مانیں گے اور بعض کا انکار کرینگے اور یہ چاہتے ہیں کہ بیچ کا راستہ اختیار کریں تو سن لو وہی لوگ اصل میں کافر ہیں اور کافروں کے لئے ہم نے رســوا کن عــذاب تیار کر رکھا ہے ۔

بادی النظر میں ذہن اس طــرف جا سکتا ہے کہ جو لوگ بعض کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے وہ ان لوگوں سے تو بہتر ہیں جــو کسی کو نہیں مانتے ۔ لیکن قــرآن کہتا ہے نہیں ان کے کافر ہونے میں ذرا بھی تامــل نہ کرنا چاہئیے حقیقت میں یہی لوگ کافر ہیں ۔ جــو لوگ کسی کو بھی نہیں مانتے ان کے بارے میں تو قرآن صرف اسی قدر کہتا ہے کہ وہ کافر ہیں ۔ لیکن بعض کو ماننے اور بعض کو نہ ماننے والوں کے بارے میں وہ زیادہ سختی کے ساتھ کافــر ہونے کا اعــلان کرتا ہے ۔ جو لــوگ عــربی جانتے ہیں وہ " اولئک ہم الکافرون " کے اســلوب بیان کی شدت اور بلاغت کو سمجھ سکتے ہیں ۔ اور اس پر " حقا " کے تاکــیدی کلمہ کا اضافہ کر کے بات کو اور بھی مستحکم کــر دیا گیا ہے ۔ ممکن ہے کسی کے ذہــن میں یہ خیال پیــدا ہو کہ اس معاملے میں قــرآن کا رویہ سخت ہے ۔ لیکن غــور کریں تو سمجھ میں آتا ہے کہ بات سخت اور نرم کی نہیں بلکہ حــق اور ناحــق کی ہے ۔ اور یہ امــر واقعــہ ہے کہ کفر جس خرابی کا نام ہے وہ ایسے لوگوں میں زیادہ ہے ۔ اس لئے ان کے ســاتھ سختی کا برتاؤ بالکل درست ہے ۔

ان تمہیدی کلمات کے بعــد اب میں انســان کی سماجی زندگی کے اس مسئلے کی طرف آتا ہوں جس کو عــدل کہتے ہیں اور معلوم کرتا ہوں کہ قرآن اس کے بارے میں کیا کہــتا ہے ۔ جہاں تک اس کے قابل قبول اور ناقابل قبول ہــونے کا تعــلق ہے تو اس کا حــال بھی ان عالمگیر آفــاقی صداقتوں کی طرح ہے جن کا اقرار باللسان کــرنے والے تو بہت ہــوں گے لیکن تصدیق بالقلب اور عملدرآمد کرنے والے خال خال ہــی نکلیں گے ۔ ایسی عامة الورود مسلمہ آفاقی صداقتیں جن کے بارے میں پوری دنیا میں شاید ایک بھی ذی ہــوش انســان ایسا نہ مــلے جــو اختلاف رکھتا ہو ، عمــلاً کتنے فیصد انســان ہیں جنھــوں نے ان صداقتوں کــو شــرف قبول بخشا ہو ۔ سچ بولنا اور جھوٹ سے اجتناب کرنا اسی طرح کی ایک بات ہے ۔ آج اگــر بذریعہ ووٹ ســاری دنیا سے رائے لی جائے تو صد فیصد ووٹ اسکے حق میں ڈالے جائیں گے ۔ لیکن اس

کو دل سے قبول کر کے ماننے والوں اور اس پر عملدرآمد کرنے والوں کا اوسط دو چار فیصد نکل آئے تو غنیمت سمجھا جائے گا ۔ آج دنیا نے عددی اکثریت کو حق وباطل کا فیصلہ کن معیار قرار دے لیا ہے ۔ لیکن قرآن کا معیار اس سے بالکل مختلف ہے ۔ اسکے نزدیک حق وہ ہے جس کی سند حق تعالی خدائے ذوالجلال سے ملتی ہو ۔ عدل قرآن مجید کی ان تعلیمات میں سے ایک ہے جن کا تاکید و تکرار کے ساتھ حکم دیا گیا ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں کو واضح کر کے اس کے خدو خال اس طرح متعین کر دیئے گئے ہیں کہ اگر کوئی شخص ہوائے نفس سے مغلوب ہو کر عمداً چشم پوشی نہ کرے تو اس کا راستہ آئینے کی طرح صاف اور کہکشاں کی طرح روشن ہے ۔

قرآن نے کہیں پر عدل کی تعریف یا اس کا لغوی و اصطلاحی مفہوم بیان نہیں کیا ۔ اس لئے کہ یہ ایک کائناتی صداقت ہے اور اسکی پہچان خود انسانی فطرت میں ودیعت کر دی گئی ہے ۔ اسے ہر شخص آپ سے آپ جانتا اور پہچانتا ہے ۔ ایک جاہل بھی اس کو اسی طرح سمجھتا ہے جس طرح ایک عالم سمجھتا ہے ۔ اس لئے قرآن نے اس کا اہتمام نہیں کیا کہ اس کی توضیح و تشریح کرے ۔ البتہ چونکہ بشری کمزوریوں اور دنیوی زندگی کی مادی آلائشوں کی وجہ سے انسان کی بصیرت پر پردہ پڑ جاتا ہے اور اسکی حالت ایسی ہو جاتی ہے کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی ۔ اس لئے بطور یاد دھانی کے کبھی تو محض حکم دے کر اور کبھی کسی کمزوری کی طرف اشارہ کر کے وہ متنبہ اور ہوشیار کر دیتا ہے ۔

یوں تو قرآن میں ایسی متعدد آیات ہیں جن میں عدل کا حکم دیا گیا ہے ، لیکن ان سب کا ذکر یہاں باعث تطویل ہو گا ۔ اس لئے میں ان میں سے چند وہ آیتیں پیش کرنے پر اکتفا کرونگا جو زیادہ جامع ہیں اور عنوان بحث سے براہ راست تعلق رکھتی ہیں ۔ سب سے پہلے سورہ نحل کی ایک آیت ملاحظہ ہو جس میں کچھ اچھی باتوں کا حکم دیا گیا ہے اور کچھ بری باتوں سے منع کیا گیا ہے ۔ لیکن ان اوامر و نواھی میں سب سے پہلے جس بات کا ذکر کیا گیا ہے وہ عدل ہی ہے ۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن انسان کی اجتماعی زندگی میں عدل کو کتنی زیادہ اہمیت دیتا ہے ۔ فرمایا ،

ان اللہ یا مر بالعدل والاحسان وایتای ذی القربی وینھی عن الفحشاء و المنکر والبغی یعظکم لعلکم تذکرون (نحل ـ ۹۰) ۔

ترجمہ :

بےشک اللہ حکم دیتا ہے عدل کا اور احسان کا اور قرابت دار کو کچھ دینے کا اور روکتا ہے بےحیائی سے اور برائی سے اور سرکشی سے وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تمہاری یاد گیری ہو۔

اس آیت میں جن باتوں کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے ان میں احسان اور رشتہ داروں سے سلوک جیسی نیکیاں بھی شامل ہیں لیکن عدل کو ان پر مقدم رکھکر یہ جتا دیا گیا ہے کہ اجتماعی زندگی کا یہ پہلا ستون ہے ۔ اسی لئے ایک حدیث میں آتا ہے کہ کفر وشرک کے ساتھ تو ایک نظام چل سکتا ہے لیکن جب کسی معاشرے سے عدل اٹھ جائے تو وہ معاشرہ قائم نہیں رہ سکتا ۔

سورۂ نحل کی اس آیت میں عدل کا صرف حکم دینے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ حکم ایک عام حاکم یا بادشاہ کا بھی واجب التعمیل ہوتا ہے۔اور اس حکم کی خلاف ورزی کیا معنی رکھتی ہے بتانے کی حاجت نہیں ۔ پھر اللہ تعالی جو سب حاکموں کا حاکم اور سب بادشاہوں کا بادشاہ ہے اس کا حکم ہم انسانوں کے لئے جو اسکی مخلوق رعیت اور بندے ہیں ، کیا معنی رکھتا ہے ، اور اس حکم کی خلاف ورزی کا کیا نتیجہ ہو سکتا ہے ، ایک معمولی عقل و فہم رکھنے والا انسان بھی اسے بخوبی سمجھ سکتا ہے ۔

قرآن کتاب ھدایت ہی نہیں کتاب حکمت بھی ہے ۔ اس لئے وہ جہاں کسی بات کا حکم دیتا ہے وہاں اسکی غرض وغایت اور حکمت و مصلحت کی بھی نشاندھی کر دیتا ہے تاکہ طبائع اسکی طرف علی علمٍ و بصیرۃٍ راغب ہوں اور لوگ اسے دل سے قبول کر کے مانیں اور اس پر عمل کریں ۔ بےلاگ عدل کے تقاضوں سے انحراف عموماً دو وجہوں سے ہوتا ہے ۔ دوستی اور محبت یا دشمنی اور نفرت ۔ دوستی اور محبت میں سب سے پہلے انسان کی اپنی ذات بیچ میں حائل ہوتی ہے اسکے بعد اعزہ اور اقربا ہیں ۔ اقربا میں بھی سب سے زیادہ والدین کی محبت عدل کی راہ میں رکاوٹ بن سکتی ہے ۔ خلّاق فطرت سے زیادہ انسان کی ان بشری کمزوریوں سے کون واقف ہو سکتا ہے ۔ سورہ نساء کی آیت ۱۳۵ میں عدل کا حکم دینے کے ساتھ فطرت انسانی کی ان کمزوریوں کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا جو عدل کی راہ میں حائل ہوتی ہیں ۔اور ان رخنوں کی نشاندھی کرنے کے بعد خلاف ورزی کرنے کی

صورت میں نتائج سے بھی خبردار کر دیا گیا ۔ فرمایا ،

یاایہا الذین آمنوا کونوا قوامین بالقسط شہداء لله ولو علی انفسکم او الوالدین والاقربین ان یکن غنیا او فقیرا فالله اولی بہما فلا تتبعوا الھوٰی ان تعدلوا وان تلوا او تعرضوا فان الله کان بما تعلمون خبیرا

ترجمہ :

اے وہ لوگ جو ایمان لائے ہو انصاف کے علمبردار رھو ۔ الله کے لئے گواھی دینے والے بنو اگرچہ اپنی ذات یا والدین یا قریبی رشتہ داروں کے خلاف ھی کیوں نہ ھو ان میں سے کوئی دولت مند ھے یا غریب بہتر ھے کہ ان کا معاملہ الله پر چھوڑ دو تو خواھش نفس کی پیروی میں عدل کو ھاتھ سے نہ دو ۔ اور اگر تم روگردانی کرو گے یا انحراف کرو گے تو سن لو کہ جو کچھ تم کرتے ھو الله اس سے باخبر ھے ۔

سورہ نساء کا تعلق اسلام کے مدنی دور سے ھے ۔ اور یہ بات معلوم ھے کہ مدینہ آ کر آنحضرت ﷺ نے قرآنی تعلیمات کے مطابق اسلامی معاشرہ ھی نہیں اسلامی ریاست کی باقاعدہ داغ بیل ڈالی ۔ اسی لئے اس آیت میں محض عدل کرنے کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ یہ کہا گیا کہ عدل کے قوام اور الله کے نقیب بنو ۔ یعنی عدل کو انفرادی زندگی سے آ گے اپنی اجتماعی و قومی بلکہ بین الاقوامی زندگی میں نافذ اور قائم کرو ۔ اس کے بعد ان رخنوں کا ذکر کر دیا گیا ھے جہاں سے عدل کے حصار کو نقصان پہنچ سکتا ھے ۔ خود اپنی ذات کے خلاف والدین یا اقربا کے خلاف حق وانصاف کا راستہ اختیار کرنا آسان کام نہیں ۔ لیکن عدل کا مثالی تصور یہی ھے کہ اس میں کسی کی رو رعایت نہ ھو حتی کہ اپنی ذات اور عزیز ترین رشتے یعنی والدین کا بھی لحاظ نہ ھو ۔ اسی پاسداری کا نام ھوائے نفس ھے جس سے بالاتر ھو کر عدل قائم کرنے کا حکم دیا گیا ھے ۔ فلا تتبعوا الھوی ان تعدلوا ۔ یعنی خواھش نفس کی پیروی میں عدل کا خون نہ کرو ۔ یہ فقرہ تاکید مزید کے لئے اور فتنے کا سد باب کرنے کے لئے دھرایا گیا ۔ اسکے بعد اس حکم سے رو گردانی کرنے کی صورت میں انجام سے خبردار کیا گیا ۔

قرآن مجید کی صرف یہی ایک آیت عدل کے باب میں عقل کل اور حرف آخر کا درجہ رکھتی ھے ۔ قرآن کی اساسی تعلیمات کے پس منظر میں اگر صرف اسی ایک آیت کو اچھی طرح سمجھ کر دل نشین کر لیا جائے تو حصول

مـدعا کے لئے کافی ھے ۔ لیکن چونکہ انسـان فطرةً بھولنے والا اور غفـلت میں پڑنے والا ھے اس لئے قرآن یاد دھانی کے لئے مختلف پیرایوں سے اپنی بات ھیر پھیر کر بیـان کرتا ھے ۔ اسی کو قرآن کی اصطلاح میں „ تصریف آیات " کہتے ھیں ۔

جس طرح دوستی اور محبت عـدل کی راہ میں بڑی رکاوٹ بنتی ھے اسی طرح دشمنی اور نفرت بھی اس راہ کا سـنگ گـراں ھے ۔ یہ صـورت حـال انفـرادی طـور پر بھی پیش آ سکتی ھے اور اجتماعی طور پر بھی ۔ قرآن جس مثـالی عـدل کا علمبردار ھے اسکے لئے وہ انفرادی ھی نہیں اجتماعی سطح پر بھی ھر حال میں عـدل کا بول بالا کرنے کی ھدایت کرتا ھے ۔ سورہ نسـاء کی مذکورۃ الصدر آیت میں جس طرح اقامت عدل اور شہادت حـق کا حکم دے کر کسی کی محبت میں عدل کا خون کرنے سے منع کیا گیا ھے سورہ مائدہ کی درج ذیل آیت میں حق و انصاف کا پرچم بلند کرنے کا اجتماعی فریضہ تفویض کر کے کسی کی دشمنی میں عدل کا خون کرنے سے روکا گیا ھے :

یأیہا الذین آمنوا کونوا قوامین للہ شہداء بالقسط ولا یجـرمنکم شـنآن قـوم عـلی ألا تعدلوا اعدلوا ھواقرب للتقوی واتقوا اللہ ان اللہ خبیر بما تعملون ۔

ترجمہ :

اے وہ لوگ جو ایمان لے آئے ھو اللہ کا پرچم بلند کرنے والے ھو جاؤ انصاف کا بول بالا کرنے والے بنو اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل کے راستے سے انحراف کرو ۔ عدل کرو کہ وہ تقوی کے زیادہ قریب ھے اور اللہ سے ڈرو بےشک اللہ جو کچھ تم کرتے ھو اس سے آگاہ ھے ۔

نساء کی طرح مائدہ بھی مدنی سورہ ھے اور ان دونـون سورتوں میں مـذکور عدل سے متعلق دونوں آیتوں میں کتنی گہری مماثلت ھے اور دونوں آیتیں ایک دوسرے کی کس طرح تائید توضیح و تکمیل کرتی ھیں اھل علم کی توجہ کے لائق ھے ۔ نسـاء میں „ قوامین بالقسط ، شہداء للہ " ھے جبکہ مائدہ میں „قوامین للہ شہداء بالقسط " ھے ۔ الفـاظ میں ایک نقطے کا فرق نہیں ھے لیکن ترکیب بدلی ھوئی ھے ۔ قسط کو اللہ کی جگہ اور اللہ کو قسط کی جگہ رکھ کر یہ بتانا مقصـود ھے کہ قـرآن کے نزدیک قسط یعنی عـدل کو کیا اھمیت حاصل ھے ۔ اس فحوائے کلام میں گویا کہ یہ دونوں لفظ ایک دوسرے کے متبادل ھیں یہاں یہ بات از خود زبان قلم پر آئے جارھی ھے کہ اللہ تعالی کے اسماء حسنی میں سے ایک عدل بھی ھے ۔

مائدہ کی اس آیت میں ” اعدلوا ہو اقرب للتقوی “ کا فقرہ بھی عدل کی ایک اسلامی خصوصیت کو واضح کرتا ہے ۔ اسلامی تعلیمات میں تقوی ملاک الحسنات اور دینی عبادات کی اول الغایات ہے ۔ روزہ فرض کیا گیا تو اس کا مقصد تقوی کو قرار دیا گیا ۔ یا ایہا الذین آمنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون (بقرہ ۔ ۱۸۳) ۔ قربانی کی مشروعیت سے بھی مقصود یہی تقوی ہے ۔ لن ینال اللہ لحومہا و لا دمائہا ولکن ینالہ التقوی منکم (حج ۔ ۳۸) ۔ اللہ کو قربانی کا گوشت پہنچتا ہے نہ اس کا خون جو چیز اسے پہنچتی ہے وہ تمہارا تقوی ہے ۔ اسلام میں تقوی اعمال کا مقصد بھی ہے اور نتیجہ بھی ۔ یہی تقوی ہے جسے یہاں عدل کی منزل قرار دیا گیا ہے ۔ فرمایا کہ عدل کرو کہ عدل تقوی سے قریب تر ہے ۔ اسکے بعد معاً فرمایا ” واتقوا اللہ “ یعنی اللہ سے ڈرو ۔ گویا عدل اور تقوی لازم و ملزوم ہیں۔

اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ جو شخص صفت تقوی سے متصف ہو کر اللہ سے ڈرے گا وہ عدل اختیار کرے گا ۔ اور جو عدل اختیار کرے گا محال ہے کہ اللہ سے نہ ڈرے ۔

قرآن انصاف کے معنی میں عربی ہی کا ایک اور لفظ قسط بھی استعمال کرتا ہے ۔ میں یہاں ان آیات کا ذکر نہیں کرتا جن میں عدل کی بجائے قسط کے لفظ سے انصاف کا حکم دیا گیا ہے ۔ ان سب آیات کو جمع کیا جائے تو مضمون بہت طویل ہو جائے گا لیکن اس نکتے کو ذہن میں رکھنا اس لئے ضروری ہے کہ اس سے پتا چلتا ہے کہ قرآن عدل پر کتنا زور دیتا ہے ۔ انصاف کا لفظ قرآن میں نہیں آیا ہے ۔ عربی ہونے کے باوجود یہ فقط اردو میں مستعمل ہے ۔

قرآن کی سماجی تعلیم کا ایک ورق جس میں قرآن کے تصور عدل کا سبق دھرایا گیا ہے وہ آیات ہیں جن میں لین دین کے وقت ناپ تول میں کمی کرنے سے منع کیا گیا ہے ۔ لین دین کے وہ معاملات جو ناپ تول کے ذریعے انجام پاتے ہیں عدل کے وہ محسوس مادی پیکر ہیں جن میں اسکی روح اس طرح جلوہ گر ہوتی ہے کہ ہر خاص و عام اس کا پہلی نظر میں مشاہدہ کر سکتا ہے اور ان معاملات میں عدل کا خون صرف وہ لوگ کرتے ہیں جن کی بصیرت و بصارت اندھی ہو چکی ہوتی ہے اور جن کے دلوں پر مہر لگ چکی ہوتی ہے ۔ اس لئے قرآن کی نگاہ میں اس کی شناعت بھی زیادہ ہے اور اس کا ارتکاب کرنے والوں کی بہت ہی سخت الفاظ میں مذمت کی گئی ہے ۔ جن

معاشروں میں یہ برائی پائی جاتی ھے اسکے افراد عموماً اس کو زیادہ اھمیت نہیں دیتے اور معمولی درجے کا جرم سمجھ کر نظــر انداز کر دیتے ھیں ۔ لیکن قرآن کی تعلیمات کے مطالعہ سے معــلوم ھوتا ھے کہ وہ اس برائی کو حد درجہ سنگین اور گھناؤنا سمجھتا ھے ۔ حد یہ کہ اس مضمون کی ایک ســورہ قرآن میں رکھی گئی اور اس کا نام ھــی اس جــرم کے اوپر رکھا گیا ۔ سورہ «مطففین » کی ابتدائی آیات میں اس برائی کی کتنی سچی تصویر ھے ۔

ویل للمطففین الذین اذا اکتالوا علی الناس یستوفــون واذا کالوھـم او وزنوھم یخسرون ۔ الا یظن اولئک انھم مبعوثون لیــوم عظیم ۔ یوم یقــوم الناس لرب العالمین ۔ (مطففین ۔ ۱ ۔ ٦)

ترجمہ :

خرابی ھے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لئے جــن کا حال یہ ھے کہ جب وہ لوگوں سے ناپ تول کر کچھ لیتے ھیں تو پورا پورا لیتے ھیں لیکن جب انھیں ناپ تــول کر کچھ دیتے ھیں تو کمی کرتے ھیں کیا یہ لوگ خیال نہیں کرتے کہ انھیں اٹھایا جائے گا ۔ ایک بڑے دن کے لئے ، جس دن کہ لوگ جہانوں کے پروردگار کے لئے کھڑے ھوں گے ۔

قرآن جس زمانے میں نازل ھــوا تہذیب و تمــدن کے لحاظ سے پسماندگی کا زمانہ تھا ۔ آج کی نسبت معاشرہ کہیں سادہ تھا اس لئے جــرائم بھــی نسبةً ســادہ تھے ۔ لیتے پورا تھے دیتے کم تھے مگر آج کل پورا لینے پر اکتفا نہیں کرتے بلکــہ زیادہ لیتے ھیں اور کم دیتے ھیں ۔ باٹ اور ترازو میں فرق کے علاوہ ڈنڈی مارنے کا فن ممکن ھے اس زمانے میں بھی رہا ھو لیکن سیر کا سوا سیر لینے کا ســراغ اس زمانے میں نہیں مــلتا جبکہ اس زمــانے میں اس کا باقاعدہ رواج ھے ۔ اس سورہ میں ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لئے « ویل » کا لفظ استعمال کیا گیا ۔ یہ ایک بد دعا کا کلمہ ھے جو قرآن صرف ان جگھوں پر استعمال کرتا ھے جہاں لعنت اور پھٹکار کا اظہار مقصود ھوتا ھے ۔ اور آخر میں قیامت کے دن کا ذکر کر کے یہ جــتا دیا گیا کہ اس کی پکڑ ھو گی اور یہ ایسا گناہ نہیں کہ اسے معاف یا نظر انداز کر دیا جائے ۔ ناپ تول میں کمــی کرنے کا گنــاہ ان گناھوں میں سے ھے جــن کے بارے میں قرآن نے تصریف کا طریقہ اختیــار کیا ھے اور بار بار توجہ دلائی ھے ۔ بعض آیتوں میں اس عمــل کو زمین میں فساد مچانے سے تعبیر کیا گیا ھے ۔

قرآن کی سماجی تعلیم کا ایک طریقه یه بهی هے که وہ ماضی کی ایسی اقوام کے قصے بیان کر کے دنیا والوں کو متنبه کرتا هے جو کسی ایک برائی میں ممتاز تهیں اور اسکی وجه سے انهیں هلاک کر دیا گیا ۔ حضرت شعیب کی قوم مدین کو اس لئے هلاک کیا گیا که وه ناپ تول میں کمی کرتے تهے اور یه برائی ان میں اس حد تک جڑ پکڑ گئی تهی که ایک نبی کے نصیحت کرنے اور ڈرانے پر بهی وه باز نه آئے اور بالآخر انهیں اس جرم کی پاداش میں تباه کر دیا گیا ۔ اصحاب مدین کی هلاکت اور تباهی کا ذکر قرآن مجید میں بار بار آیا هے ۔ سب سے زیاده تفصیل سوره هود میں بیان هوئی هے ۔ آیت ۸۴ تا ۹۵ پورے دو صفحوں میں یه قصه بیان هوا هے ۔ میں یہاں شروع اور آخر کی دو دو آیتیں نقل کرتا هوں ۔

و الی مدین اخا هم شعیباً قال یا قوم اعبدوا الله مالکم من اله غیره ولا تنقصوا المکیال والمیزان انی اراکم بخیر و انی اخاف علیکم عذاب یوم محیط ۔ ویا قوم او فوا المکیال والمیزان بالقسط ولا تبخسوا الناس اشیاء هم ولا تعثوا فی الارض مفسدین . . . . واخذت الذین ظلموا الصیحة فاصبحوا فی دیارهم جاثمین ۔ کان لم یغنوا فیها الا بعداً لمدین کما بعدت ثمود ۔

ترجمه :

اور هم نے بهیجا مدین کی طرف ان کے بهائی شعیب کو ، اس نے کہا اے میری قوم پرستش کرو الله کی ، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ، اور ناپ تول میں کمی نه کرو ، مجهے تمہاری بهلائی منظور هے ، اور مجهے ڈر هے که تمہارے اوپر گهیرنے والے دن کا عذاب نه آ جائے ۔ اور اے میری قوم ناپ اور وزن کو پورا کرو انصاف کے ساتهـ ، اور لوگوں کی چیزیں ظلم سے نه لو اور زمین میں فساد نه مچاتے پهرو . . . . اور جن لوگوں نے ظلم کیا انهیں چیخ نے آلیا اور وه اپنے گهروں میں سینے کے بل زمین سے الگ گئے ۔ جیسے وه ان گهروں میں تهے هی نہیں ۔ آگاه مدین کے لئے هلاکت ، جس طرح ثمود هلاک هوئے ۔

اس آیت میں امر ونهی ، انذار و تذکیر ، هر طریقے سے اس برائی کو ختم کرنے کی طرف توجه دلائی گئی هے ۔ اس میں خاص توجه کی بات یه هے که اهل مدین کی هلاکت و تباهی کا بڑا سبب ان کی یہی برائی تهی ۔ اس سے یه ظاهر هوتا هے که یه برائی جسے عام طور پر معمولی خیال کیا جاتا هے اگر کسی معاشرے میں عام هو جائے تو اس معاشرے پر من حیث القوم عذاب آتا هے اور وه معاشره

ھلاک و برباد کر دیا جاتا ھے ۔ یہاں یہ فرق بھی لائق توجہ ھے کہ قرآن نے جہاں صرف عدل اور قسط کا حکم دیا ھے وھاں انذار و تنبیہ کے تمام ذرائع سے کام لینے کے باوجود اس دنیا میں عذاب الٰہی ھلاکت اور تباھی کی وعید نہیں سنائی جبکہ عدل کے اس خاص معاملہ میں حکم خداوندی کی خلاف ورزی پر اسی طرح انجام بد سے خبردار کیا گیا ھے جس طرح ام الکبائر کے ارتکاب پر خبردار کیا گیا ھے ۔ اس کی وجہ بالکل ظاھر ھے ۔ ناپ تول میں کمی ان منکرات میں سے ھے جن کے لئے کوئی عذر تلاش نہیں کیا جا سکتا اور اس کے مرتکب افراد یا اقوام سے کسی خیر کی توقع نہیں کی جا سکتی اس لئے ان کو عضو فاسد کی طرح ناقابل اصلاح قرار دے کر تباہ و برباد کر دینا ھی قرین مصلحت ھوتا ھے ۔

عدل ایک ایسا عمل ھے جو انسانی معاشرے کی اجتماعی ضرورت ھے اور یہ ایک ایسا احساس ھے جو ھر فرد بشر کے وجدان میں موجود ھے ۔ مستزاد یہ کہ خود خدا اپنی کتاب میں اس کا حکم دے کر اسکی اھمیت کو دلوں میں راسخ کرتا ھے ۔ لیکن اس کے بعد بھی امر واقعہ یہ ھے کہ جس کو عدل کہتے ھیں وہ اس عالم کا عنقا ھے ۔ فرد ھو یا جماعت ، ایک حکومت ھو یا ایک شہری عدل کے اس تصور کی کار فرمائی بہت کم نظر آتی ھے جس کی تلقین قرآن مجید کرتا ھے ۔ اس تصور کو تصدیق میں ڈھالنے کے لئے ضروری ھے کہ قرآن کے پیش کردہ عقائد و اعمال اور اخلاق و معاملات کو کل کا کل بیک وقت بغیر کسی رد و بدل ، کمی بیشی یا رنگ آمیزی کے پورے اخلاص و للھیت کے ساتھ اپنایا جائے ۔

★ ___ ★